

راشدہ رفعت

حکیمیت و حکایت



دے۔ میرے کہنے پر انڈا تک نہیں بتا رہیں۔“ حتا نے منہ چملا کر شکوہ کیا۔

اس شکوے پر شائستہ ایک بلبل کو خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے بیٹے اور بیٹی میں بھی فرق نہ رکھا تھا۔ وہ صفتی امتیاز کی قائل ہی نہ تھیں۔ بس کھانے بیٹے کے معاملے میں بیٹے کی فرمائشیں پوری کر دیتی تھیں اور بیٹی کو نظر انداز، تو اس کے پیش نظر بھی بیٹی کا ہی بھلا تھا۔ بیٹی کو آگے جا کر کسی بھی ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں دشواری نہ ہو ان کا رخ نظر صرف یہ ہی تھا۔ لیکن اب حتا سمجھ دار ہو رہی تھی وہ اپنا چھوٹے بھائی سے موازنہ کرنے لگی تھی اور شائستہ ہرگز نہیں جانتی تھیں کہ وہ کسی بھی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو۔

”اچھا بچوں کرتے ہیں، میں تمہیں آلو گو بھی کا خستہ سا پراٹھا بنا دیتی ہوں۔ تمہیں روٹی کے ساتھ گو بھی کا سالن اچھا نہیں لگتا تو کچن براٹھا کتنا مزے کا بنے گا۔“ انہوں نے درمیانی راستہ نکالا۔

”اور کیا آبی؟ آلو گو بھی کھا کر تو انسان پاورفل بنتا ہے۔ میں تو کر لے اس لیے نہیں کھاتا کیونکہ وہ کڑوے ہوتے ہیں۔“ حتا سے من برس چھوٹے نیپو نے بھی بہت مدد بین کر بہن کو سمجھایا۔

”تو میرے حصے کی آلو گو بھی کھاتی تھی تم کھالیا کر دو ناں چھوٹو، اچھا ہے تم مزید پاورفل بن جاؤ گے۔ حتا نے چھوٹے بھائی کے چھوٹے چھوٹے گالوں کو پیار سے کھینچتے ہوئے کہا۔

”یہ غنیمت تھا کہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ شائستہ اپنے دونوں بچوں پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے حتا کے لیے پراٹھا بنانے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

شائستہ کے شوہر اجمل ”بچے دو ہی اچھے کے فارمولے“ پر یقین رکھنے والے شخص تھے۔ شائستہ کی خواہش تھی کہ حتا کی بہن نایبو کے بھائی کو جنم دے کر وہ کم از کم ایک جوڑی تو مکمل کر دیں۔ بہن، بہن کے

”امی پلیز میرے لیے آلیٹ بنا دیں۔ میں آلو گو بھی نہیں کھاؤں گی۔“ حتا نے منت بھرے لہجے میں ماں کو مخاطب کیا۔

وہ بانچوس جماعت کی طالبہ تھی ہرگز بھی ضدی یا بدتمیز نہیں تھی بس کھانے پینے کے معاملے میں مخصوص پسند، ناپسند تھی۔ سبزیوں میں آلو گو بھی اس کے حلق سے نہ اترتی تھی۔ لیکن شائستہ کو بیٹی کی پسند ناپسند سے کوئی سروکار نہ تھا وہ اس کے لیے بھی کچھ الگ سے بنانے کا تردد نہ کرتیں۔ وادی بے چاری کو ہی لاڈلی پوتی پر ترس آ جاتا۔

”اے شائستہ! اپنی کوئل دسے ناں انڈا اور نہ بھوکی ہی سو جائے گی۔“

”اباں! میں ماں ہوں اس کی مجھے کم پیاری تو نہیں یہ، لیکن میں اس کی عادتیں بگاڑنا نہیں چاہتی لڑکیوں نے کل کو اگلے کمر بھی جانا ہوتا ہے انہیں ہر طرح کے کھانے کی عادت ہونی چاہیے ورنہ بعد میں بڑی تھک ہوتی ہیں۔“ شائستہ نے رسانییت بھرے لہجے میں ساس کو جواب دیا تھا۔

ان کے پیش نظر ان کا اپنا تجربہ تھا۔ میسے میں گوشت کے علاوہ کھانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ ٹنڈے، بھنڈی کدو اور اردو جیسی سبزیاں بھی ہمیشہ گوشت کے ساتھ بنائی جاتیں۔ اور سسرال میں جب کدو گوشت اور اردو گوشت کے بجائے محض کدو کی ترکاری اور شوربے والا اردو کا سالن کھانا پڑا تو انہیں کتنی مشکل سے ایسا کھانا کھانے کی عادت پڑی تھی۔ پہلے پہل تو وہ دو چار نوالے لے کر اٹھ جاتیں لیکن سسرالی مشقت خالی پیٹ بھی تو نہ بھگتی جاسکتی تھی سو آہستہ آہستہ انہوں نے دستاب کھانے سے ہی پیٹ بھرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ اب حتا کو مخصوص کھانوں کا عادی نہ بنانا چاہتی تھیں لیکن بیٹی جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی ان کے اس رویے سے شاکہ ہوتی جا رہی تھی۔

”کل نیپو نے کر لے کھانے سے انکار کر دیا تھا تو آپ نے فوراً فریزر میں سے دو کباب نکال کر کھل

ساتھ دکھ سکھ کہتی ہے تو بھائی، بھائی کا سہارا ہوتا ہے لیکن اجمل نے اس معاملے میں بیوی تو چھوڑ ماں تک کی نہ کی تھی۔ اور اب بچے بڑے ہونے کے بعد تو شائستہ بھی اپنی اس خواہش سے دستبرداری اختیار کر چکی تھی۔ اب ان کی ساری توجہ حنا اور نیپو کی تعلیم و تربیت پر مرکوز تھی۔ دونوں بچے ہی پڑھائی میں اچھے تھے۔

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ حنا کے ماسٹرز کا پہلا سال تھا تو نیپو کا لاہور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔ بہاولپور اور لاہور میں چند گھنٹوں کی مسافت کے باوجود سب گھر والے نیپو کے دور جانے پر بہت رنجیدہ تھے مگر معاملہ چونکہ اس کے روشن مستقبل کا تھا سو عارضی جدائی کا یہ کڑوا ٹھونٹ چٹا ہوا۔

ماں کے لاڈ لے اور آپنی کے دلارے کو جب ہاسٹل لائف بگھٹتی پڑی تو اس کے صبح معنوں میں جودہ طبق روشن ہو گئے۔ شائستہ نے بیٹے کو بہت تازہ دم میں پالا تھا۔ وہ بیٹے کی فرمائش پر اسے اس کامن پینڈی میں کھلائی تھیں، اب جب نیپو کو ہاسٹل میں کے پیکیج پیٹھے کھانے پڑے تو وہ اتنا تنگ آیا کہ ایک دو بار تو انجینئرنگ کی ڈگری چھوڑ چھاڑ کر واپس بہاولپور جا کر وہاں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی سوچنے لگا۔ لیکن پھر شندیل دل سے اس آپشن پر غور کیا تو یہ زری حماقت لگی۔ لوگ جس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے ایڑی چوبی کا زور لگاتے ہیں وہ اپنی ذہانت کی بنا پر وہاں سو فی صد میرٹ پر منتخب ہوا تھا ماں، باپ کے خواب کو ادھورا چھوڑ کر جانے کی حماقت کیسے کرتا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہ ہی کھانا ہر مار کر نیکم کیا۔

اس کے روم میٹس کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ہونٹنگ کرتے اسے بھی ساتھ چلنے کا کہتے مگر اسے بخوبی احساس تھا کہ اس کے سفید پوش والدین اس جی پڑھائی کا بوجھ ہی بہت سہج تان کر کے اٹھا رہے ہیں وہ جب خرچ بڑھانے کا مطالبہ کرے ان کی مشکلات میں مزید اضافہ کرنے کا

تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن بہاولپور جاتا تو ماں اس کی شکل دیکھ کر پریشان ہو جاتیں۔

”کتنا کمزور ہو گیا ہے نیپو تو، اتنا سامنے نکل آیا ہے۔ کیا ہاسٹل والے کھانے کو نہیں دیتے؟“ وہ پریشان ہو کر استفسار کرتیں۔

”دیتے ہیں ای۔ شورے میں تیرے آلو بیٹھن، ادھ گلے چاولوں والی بریانی، چکی چکی سی بھنڈیاں، ہاں آلو گوشت اور ماش کی دال مزے کی ہوتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر ماں کو بتایا۔

چھٹیاں گزار کر جب اس نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا تو ماں نے کھانے پینے کی بہت سی سوچائیں بھی ہمراہ کر دیں جو اس کے چھوڑے روم میٹس دونوں میں ہی چٹ کر گئے۔ اگلی بار اس نے ماں کو یہ تر دو کرنے سے منع کر دیا۔

”آپ کی محنت اور پیسہ سب ضائع جاتا ہے ای۔ میرے دوست میرے لیے کچھ نہیں چھوڑتے، مزے لے لے کر سب کچھ خود ہڑپ کر جاتے ہیں۔“ شائستہ دل موس کر رہ گئی۔

☆☆☆

نیپو کی پڑھائی کا آخری سال تھا جب حنا کی شادی ہو گئی۔ وہ اجمل کے چچا زاد بھائی کی بیوی تھی۔ سسرال قریب ہی تھا لیکن اس کے بغیر گھر بالکل سوتا ہو گیا۔ دادی اپنی لاڈلی کی رحمتی کے بعد فقط دو ماہ جی پامیں اور دادی کے بعد اجمل بیٹی اور ماں کو یاد کر کے آئیں بھرتے رہتے۔ حنا ہر تیسرے، چوتھے دن ماں باپ کے پاس چکر لگاتی لیکن ایک دو گھنٹے بعد واپسی کی راہ لیتی۔ گھر پر دوبارہ سناٹا چھا جاتا۔

”اسی لیے کہتی تھی اجمل صاحب، کم از کم تین بچے تو ہو لینے دیتے تو گھر ایسا کاٹ کھانے کو نہ دوڑتا۔“ شائستہ شوہر کو جانتیں۔

”نیک بخت کیا! گارنٹی ہے کہ تیسرا بچہ ہمارے ساتھ ہوتا۔ لڑکا ہوتا تو بھائی کی نقش قدم پر پڑھائی کی خاطر ہاسٹل میں ہوتا بیٹی ہوتی تو اس کی رحمتی کے

دن بھی قریب ہوتے۔“ اجمل ٹھنڈا سانس بھر کر کہتے۔
 ”تو دنیا کی جینیوں کی رخصتی ہوتی ہے آپ نے تو زیادہ ہی دل پر لے لیا۔“ وہ شوہر کو سمجھا جس۔
 ”پتا نہیں بیگم، اب دل میں بہت بے گلی سی چھائی رہتی ہے۔ لگتا ہے اب اپنی رخصتی کے دن بھی قریب ہیں۔“

”اللہ کا نام لیں اجمل صاحب، کیوں دل دھلاتے ہیں؟“ شائستہ انہیں خطی سے گھورتی۔
 لیکن خدشہ شوہر کے دل کا ہی سچا ہوا۔ معمولی سا روڈ ایکسڈینٹ تھا بظاہر چوٹ بھی معمولی تھی لیکن دو روز کی بے ہوئی کے بعد کمر والوں کو دوائی جدائی کا صدمہ دے کر اجمل زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔
 شائستہ پر تو جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ زندگی کا ساتھ اس عمر میں جب انہیں اس کے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی یوں منہ موڑ جائے گا، یہ تو انہوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ نیچو اور تاجپاٹ جیسا نم برداشت کرتے ہوئے ماں کو سنبھالنے کی تک دود میں لگے ہوئے تھے۔

نیچو کے ہاتھ میں ڈگری آچکی تھی لیکن آبائی شہر میں ملازمت کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے اسے لاہور میں ہی نوکری ملی تھی۔ پڑھائی کے اہتمام اور نئی نوکری کو جوائن کرنے کے درمیانی وقفے کے چار، چھ ماہ اس نے ضرور ماں کے پاس گزارے پھر دوبارہ لاہور کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اب شائستہ کو اس کا گھر بسانے کی جلدی تھی۔

”پلیز ای! مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے کچھ وقت تو دیں۔ یہ نوکری بہت اچھی تھی لیکن میری منزل نہیں ہے، میں نے ابھی بہت آگے جانا ہے۔“

”اللہ تمہارے سارے خواب پورے کرے میرے بچے، لیکن اپنی ماں کا یہ خواب پورا ہو لینے دو۔ تمہارے ابو تمہاری خوش دیکھے بغیر دنیا سے منہ موڑ گئے ان کے بعد مجھے خود یہ زندگی چھٹی ہے بات

اور ناپائیدار لگنے لگی ہے تم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ میں چاہتی ہوں جیسے جی تمہارے سر پر سہرا سجا دیکھ لوں۔“

شائستہ کی خواہش پر فرما کر دار بیٹے نے سر تسلیم خم کر دیا۔ انہوں نے نیچو کو پسند کی لڑکی سے شادی کا اختیار دیا تھا لیکن وہ ماں کی بات سن کر جھپٹ کر ہنس پڑا تھا۔

”آپ نے شرافت کی جو گھٹی دے کر لاہور بھیجا تھا ناں امی۔ اس کے نتیجے میں میں نے اتنی شرافت والی زندگی بسر کی ہے تاکہ میں سینئرز کے ساتھ ساتھ جو نیوز کا بھی نیو بھائی بن کر رہ گیا تھا۔“ شائستہ نے محبت بھری مسکراتی نگاہ خود دیکھنے کے چہرے پر ڈالی۔

نیچو کے لیے انہوں نے اپنی خالدہ زوہبہ کی بیٹی کو منتخب کیا تھا۔ عقیلہ باجی شجاع آباد میں رہتی تھیں۔ خود بھی سرکاری اسکول کی استانی تھیں اور شوہر بھی محکمہ تریس سے وابستہ تھے۔ ان کے باج بچوں میں آریہ سب سے چھوٹی تھی۔ ملتان کی یونیورسٹی سے فزکس میں ماسٹرز کر رکھا تھا اور اب ایم فل کی ڈگری لینے کے قریب تھی۔ عقیلہ باجی نے اپنی بچیوں کی تربیت بہت ہی اچھے ذہب پر کی تھی۔ نیچو نے بھی خاندانی فنکشنز پر اسے دو چار بار دیکھ رکھا تھا۔ اس نے ماں کی پسند پر بخوشی سر جھکا دیا۔

☆☆☆

لابد رخصت ہو کر سرسرا آئی تو شائستہ نے ڈیزدہ دو ماہ اس کے خوب لاڈ اٹھا کر اسے نیچو کے سنگ لاہور بھیج دیا۔

”شادی کے بعد بھی میرا بیٹا بازاری کھانے کھائے اور لاہور بہاد پور کے چکر کی کاٹار ہے تو کیا فائدہ ایسی شادی کا۔ خیر سے لاہور جاؤ اور اپنی گھر گریہ کا آغاز کرو۔“ انہوں نے پیار سے بیٹے، بہو کو مخاطب کیا۔

”آپ میرے ساتھ جانے پر ہامی بھریں تب ہی میں لائبر کو ساتھ لے جاؤں گا۔ آپ کو اکیلے

یہاں کیسے چھوڑوں۔“ نیچر مند پراتر آیا۔

”میں اکیلی کہاں ہوں۔ آس پر دس والے سب کتنے اچھے ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو روز کے روز چکر لگاتی ہے۔ میرا یہاں خوب دل لگا ہوا ہے اور میں نے تمہارے پاس آنے سے انکار کیا ہے جا کر اپنا گھر میں کرو۔ کرائے کا ہے تو کیا ہوا۔ اب بیوی ساتھ جا رہی ہے تو دیکھنا کیسے مکان سے گھر میں جائے گا پھر میں بھی چکر لگاؤں گی۔“ انہوں نے بہلا پھسلا کر نئے نئے فریب دیا۔

اس گھر میں ان کے شوہر کی یادیں بسی تھیں وہ خود میں یہ گھر چھوڑنے کی ہمت نہ پائی تھیں پھر اب وہ دونٹ کھٹ سے نواسوں کی نانی تھی تو میں جو روز نانی سے لاڈ اٹھوانے پہنچ جاتے تھے، ان سے دور جا کر شائستہ کا دل کیسے لگتا۔

نیچو بھی لاہور چند ماہ ہی رہ پایا تھا پھر روزگار کا چکر اسے کراچی لے گیا۔ وہاں تو کڑی زیادہ اچھی تھی۔ تنخواہ بھی پرکشش تھی۔ لائبریری میں ایک اچھی سا کھدالی پرائیویٹ یونیورسٹی میں ٹیکہ پر رقعینات ہو گئی۔

اللہ نے لائبریری اور نیچو کو کیے بعد دیگرے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا۔ شائستہ دو چار ماہ بیٹا بھوکے پاس گزارتیں پھر گھر اور بیٹی کی یادستانی تو واپس بہاولپور کا رخ کرتیں۔ نیچو نے ماں کی دیکھ بھال کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کیا ہوا تھا جو شائستہ کے کراچی ہونے کی صورت میں بھی گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شائستہ سعادت مند اولاد کو ہر گھڑی دعاؤں سے نوازیں۔ نواسوں، پوتے اور پوتیوں کی صورت میں رب نے ان کی جمجمی میں ہر نعمت ڈال دی تھی۔ لیکن اب جانے کیوں کچھ دنوں سے انہیں مرحوم شوہر کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی۔

”شاید تمہارے ابو کا وہاں جی نہیں لگ رہا۔ تین راتوں سے مجھے متواتر خواب میں نظر آ رہے ہیں لگتا ہے اب میرا بلا وہ ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر بیٹے کو مخاطب کیا۔

وہ ان کے منہ سے ایسی باتیں سن کر خفا ہو جاتا تھا۔ لیکن شوہر کی طرح ان کا وجدان بھی سچا ثابت ہوا۔ ایک رات وہ سوئیں تو صبح کا سورج نہ دیکھ پائیں ان کی اولاد کی تو گویا دنیا ہی تاریک ہو گئی۔ دل کو اطمینان صرف اس امر سے ہوتا کہ ماں آخری سے ان سے بہت خوش تھی اور اس کے لیوں پر ان کے لیے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔

☆☆☆

”آپنی اس گھر سے میری اور آپ کی سنہری یادیں جڑی ہیں لیکن زندگی کی سچ جھلکیں ہمارے جذبات و احساسات کی پروا کب کرتی ہیں۔ میں نے کراچی میں گھر خریدتا ہے میری اور لائبریری کی نوکری وچیں بے ظاہر ہے ہمارے بچوں کا مستقبل بھی وہیں ہے میں امی، ابو والا گھر چھوڑ کر آپ کو آپ کا حصہ دینا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے آپ کی اجازت درکار ہے۔“

نیچو اور لائبریری کے گھر سے جان چھڑاتا چاہتے تھے اس لیے نیچو نے جی کڑا کر کے حنا سے آبائی گھر بچنے کی اجازت مانگی تھی۔ پاپی بانی جوڑنے کے باوجود کراچی جیسے شہر میں اچھی رہائش گاہ حصول ممکن ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

”اتنا شرمندہ ہو کر گھر فروخت کرنے کی اجازت کیوں مانگ رہے ہو نیچو، یہ تمہارا حق ہے، لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ تم سے اپنا حصہ لینے کے بجائے ہمیں تمہارے حصے کی رقم ادا کروں۔“

”یعنی آپ یہ گھر خریدنا چاہتی ہیں۔“ نیچو نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں نیچو! ارسلان وغیرہ سب بھائی اپنا آبائی گھر فروخت کر رہے ہیں۔ سب کے بچے بڑے ہو گئے۔ دو، دو کمروں میں اب کسی کا گزارہ نہیں، اس لیے سب نے فیصلہ کیا ہے کہ گھر فروخت کر کے اپنا اپنا حصہ لیں اور اس میں اپنی جمع پونجی شامل کر کے اپنا اپنا مکان خریدیں۔ میں تو تم سے خود اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی، یہ علاقہ ہمارا دیکھا بھلا ہے بچوں

یہ گھر جوابِ حنا کی ملکیت تھا لیکن آج بھی نیپو یہاں آکر اتنا ہی سکون محسوس کرتا جیسے اپنے گھر لوٹ آیا ہو۔

”زوروں کی بھوک لگی ہے آبی، کیا بنایا ہے؟“

تھوڑی گپ شپ کے بعد وہ بے تکلفی سے بولا۔

”میں نے تو سادہ سا مٹر پلاؤ بنایا ہے آنے سے پہلے بتاتے تو میں کچھ اہتمام تو کر لیتی۔“ حنا بولی تھی۔

”ارے آبی! آپ کے ہاتھ کا سادہ سا مٹر پلاؤ بھی میرے لیے کسی شای نیافت سے کم نہیں۔ بس جلدی سے دسترخوان لگائیں۔“ نیپو کے منہ میں واضحیائی بھر آیا تھا۔ بہن کے ہاتھ میں بالکل ماں والا ذائقہ تھا وہ جب بھی یہاں آتا فرمائشیں کرنے میں میکے آئی لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا۔

حنا نے دسترخوان لگادیا۔ مٹر پلاؤ، رائیہ سلاو اور پودینے، ٹماٹر اور ہری مرچ کی چٹنی۔ نیپو نے تو دسترخوان بنادیکھ کر ہی ہنسا رہا تھا۔ البتہ عالیان کا تھوڑا سا منہ بند گیا تھا۔

”مجھے تو مٹر والے راس اچھے ہی نہیں لگتے پھوپھو، مجھے کچھ اور بتادیں۔ اس نے بے تکلفی سے فرمائش کی۔“

”ادیار! کھا کر تو دیکھ، اپنی پھوپھو کے ہاتھ کے مٹر والے راس اچھے نہ لگیں تو کہنا۔“ نیپو نے چاولوں سے بھرا اچھے منہ میں ڈالتے ہوئے بیٹے کو مخاطب کیا۔

”واہ آبی! حنا ہی آگیا۔“

نیپو نے تعریف کی اور حنا جانتی تھی کہ وہ ہر ہر نوالے پر ایسے ہی تعریف کرے گا۔ بھائی پر محبت بھری نگاہ ڈال کر حنا لاڈلے بیٹے کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہاں اب بتاؤ پھوپھو کی جان۔ کیا کھانے کا موڈ ہے؟“ اس نے عالیان سے پوچھا۔

”یہ یہ کھانے کا آبی۔ اس کے بے جا خرچے مت اٹھائیں۔ پھر کیا کمال کا مٹر پلاؤ ہے۔“ نیپو

کے اسکول یہاں سے قریب ہیں پھر میرے جینے، دیور بھی قرب و جوار میں ہی مکان خرید رہے ہیں۔ ارسلان کہتے ہیں گھر ایک نہ سہی، ہم بھائیوں کا علاقہ ہی ایک ہو۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی امی ابو کا اتنی محبت سے تعمیر کیا ہوا آشیانہ کسی غیر کو سونپنے کی ہمت نہیں پاتی۔ اسی لیے یہ فیصلہ کیا کہ یہ گھر ہم سے خرید لوں۔“ حنا کے کہنے پر نیپو کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

”میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہوگی آبی۔ گھر آپ خرید لیں گی تب بھی اس گھر کے دروازے میرے اور میرے بچوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہی رہیں گے نا۔“ اس کے کہنے پر حنا نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ہر سال گرمیوں کی چٹنیوں میں جب لائیب اپنے میکے شجاع آباد آتی تو اسے واپس لےنے نیپو بیٹے بھرگم چٹنی لے کر آتا وہ دن سرال تو باقی باچا دن بہن کے پاس گزارتا۔ کورونا کی وجہ سے دو سال تک لائیب میکے نہ آ پائی تھی اس بار وہ چٹنیوں میں میکے آئی تو نیپو بھی ہمراہ تھا۔ وہ اپنی سالانہ چٹنیاں بہن کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن حنا کو سربراہ ازدینے کے چکر میں اس نے اسے اپنی آمد کے متعلق نہ بتایا تھا۔

دو تین دن سرال میں گزار کر جب اس نے بہاؤ پور کا رخ کیا تو عالیان نے ساتھ جانے کی ضد پکڑ لی۔ اسے نانا، نانی کے گھر سے زیادہ پھوپھو کے گھر رہنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ وہاں لاڈ اٹھانے کو پھوپھو تو تھیں ہی، ارحم اور راحم بھی اپنے چھوٹوں کے خوب ہی مزے کرواتے تھے۔ نیپو بیٹے کو روکنے کی اپنی سی سی کر رہا تھا لیکن جب لائیب نے بھی کہہ دیا کہ لے جائیں یہ یہاں پر بورسی ہوگا تو نیپو کو اسے ساتھ لے جانے پر کیا اعتراض ہوتا۔ وہ اور عالیان اچانک ہی حنا کے گھر پہنچے تھے اور اپنی آبی کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے یہ رنگ دیکھنے کو ہی تو نیپو نے اس سربراہ ازدین کا اہتمام کیا تھا۔

مڑے لے لے کر کھارہا تھا۔
آپ مر گئی۔ لائیبہ ہر لحاظ سے آئینڈیل لائف پائزر
ہے۔ لیکن وہ کیسا پکالی ہے، یہ آپ بھی جانتی ہیں۔
نیپو کے کہنے پر حنائی نے اسے مہورا۔

”شرم کرو، اپنی اچھی بیوی کی برائی کر رہے
ہیں۔“ بھادوچ اسے اتنی ہی پیاری مگی کہ اس کے پیٹھ
پیچھے بھی اس کی سائیڈلی۔

”افوہ ڈلی! یہ برائی نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں
میں لائیبہ سے کتنی محبت کرتا ہوں اور ہم دونوں کے
درمیان جیسی کمال کی اعزرا سٹینڈنگ ہے۔ لیکن اب اس
بے چاری کو کھانا پکانا نہیں آتا تو اس میں اس کا کیا قصور

۔ عقلیہ خانہ خود رو رکھ دوں میں سب کچھ پریشر مگر میں
ذال کر جھٹ پٹ پکانے والی۔ لائیبہ نے بھی اپنے گھر

سے یہ ہی سیکھا۔ اب بے چاری میری خاطر نیٹ سے
رہ سبب کچھ کر پکانے کا جین تو کرتی ہے۔ لیکن میں اسے

خود ہی جین کو زیادہ تاہم دینے سے منع کر دیتا ہوں ظاہر
ہے وہ بھی میری طرح کمانے گھر سے نکلتی ہے اس کا

احساس کرتا میرا فرض ہے اسی لیے ہنسی خوشی اس کی
جھٹ پٹ رہ سبب والے پکانا کھالیتے ہیں۔ مہینے میں

ایک دو بار ہونٹنگ..... گزارہ ہو جاتا ہے آپ۔ میں
اسی لیے تو عالیان کو بھی سمجھاتا ہوں کہ لڑکوں کو ہر طرح

کے کھانے کا عادی ہونا چاہیے۔ لڑکیاں تو پھر شادی کے
چھ، آٹھ سال بعد جب جوائنٹ فیملی سے الگ ہوتی ہیں

تو اپنی راجدھانی کی آپ مالک ہوتی ہیں۔ اب اپنی
مثال لیجیے۔ اپنا من بھاتا ہی کھاتی ہیں ناں۔ کھانے

پکانے کے طریقے بھی امی والے اور ویسا ہی ہاتھ کا
ذائقہ۔ مجھ سے پوچھیں ایسے ذائقہ دار کھانوں کی

قدر۔“ نیپو نے ایک بار پھر چادلوں سے پیٹ بھری۔
حنائے بھائی کو محبت سے دیکھا پھر چپکے سے

آنکھوں کی نمی صاف کی۔ ماں یا دہی اس شدت سے
آئی تھی۔ ماں کو پتا ہوتا کہ کھانے پینے میں سمجھوتا جینی

کے بجائے اس کے بچے کا مقدر رہنے گا تو شاید وہ اپنی
حکمت عملی تبدیل کر لیں۔ حنائے ہونٹوں پر مغموم
مسکراہٹ بھر گئی تھی۔

”امی! آپ اور ماموں سکون سے کھانا
کھائیں اس چھوٹی ٹینشن نہ لیں۔ یہ جانے اور ہم
جائیں۔ جاؤ راحم بائیک کی چابی لے آؤ۔“ فرسٹ
ایئر کے اسٹوڈنٹ ارم نے بھائی کو یکراں پھر چند لمحوں

میں ہی وہ دونوں اپنے اس چھوٹو کو بائیک پر بٹھایا جا
اور وہ جا۔
عالیان کا ایسے ہی تو پھوپھو کے ہاں جی نہ لگتا
تھا اب راحم اور ارم بھائی کے ساتھ کوئی مزید ارسی
دعوت ازا کر ہی اس نے گھر لوٹنا تھا۔

”بہت بگڑ گیا ہے۔ یہ میں اسے لاکھ سمجھاتا ہوں
کہ لڑکوں کو سب کچھ کھانے کی عادت ہونی چاہیے مگر

صاحب زادے کی عقل میں بات سہلی ہی نہیں۔“ نیپو
نے غصے سے انداز میں بچے کا منہ کھرا کیا اور۔

بھائی کے منہ سے یہ بات سن کر ایک لمحے کو حنا
ساکت رہ گئی تھی۔ وقت کا پیرہ گویا لاکھ گھومتے ہوئے

اسے برسوں پہلے کے ایسے ہی سطر میں لے گیا تھا۔
بات یہ ہی مگی مگر کہنے والی ہستی ماں کی مگی اور مخاطب

وہ خود مگی اور آج لاڈ لا بھائی قدرے مختلف انداز میں
ماں والی بات ہی دہرا رہا تھا لیکن وہ یہ بات اپنی

بینیوں کے بجائے بچے کے لیے کر رہا تھا۔
”ابھی بچہ ہے عالیان، بڑا ہو گا تو عادتیں خود

بخود سنور جائیں گی۔“ حنائے حال میں لوٹتے
ہوئے بھائی کو سمجھاتا جاہا۔

”نہیں! آئی! انجین کی پختہ عادتیں اتنی آسانی
سے جان کب چھوڑتی ہیں۔ میرا تجربہ ہے آپ کے

سامنے ہے۔ امی نے کس لاڈ سے پالا تھا۔ ہر فرمائش
منہ سے نکلتے ہی پوری ہوتی۔ جب ہاشل گیا تو عقل

ٹھکانے آ گئی۔ ماں کے ہاتھ کی بنی مخصوص چیزوں
کے علاوہ من کو کچھ بھاتا ہی نہ تھا۔ شادی کے بعد سوچا

تھامن پسند کھانے کو ملے گا لیکن یہ حسرت اپنی موت